

طالبانِ علومِ نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

عزیز و اور دوستو! نبوت نے ہم کو جو علوم و حقائق اور جو اصول و ضوابط عطا کئے ہیں ان میں ایک شوشہ اور ایک نقطہ کی ترمیم ممکن نہیں، آپ کے اسلاف کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انہوں نے ان میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور اس ذخیرے کو ہمارے ہاتھوں تک بے کم و کاست پہنچا دیا لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ ہمارے انہیں اسلاف نے ہر دور اور ہر عصر میں اس ذخیرے کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، انہوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اس ذخیرے کو ایک زندہ قابل عمل اور نمونہ پذیر ذخیرہ ثابت کیا، انہوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ ان کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کیا اور ان کو اپنے زمانہ میں اپنی عقلی سطح اور ذخیرے کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا، ان میں اصل شریعت، مقاصد دین اور منصوبات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت تھی لیکن اس کی تعبیر و تشریح میں، اس کی توضیح و تفہیم میں شاخ گل کی سی چلک اور ریشم کی سی نرمی تھی، ان کا عمل دراصل سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی اس حکیمانہ ہدایت پر تھا: ”کلمو الناس علی قدر عقولہم اتریلون ان یکذب اللہ و رسولہ“ اس لئے انہوں نے ہر زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح و ترجمانی کا فریضہ انجام دیا، اور اس زمانہ کے نفسیات و ضروریات کا لحاظ کیا۔ تیسری صدی میں مامون و معتصم کی سرپرستی اور یونانی علوم کے اثرات سے معتزلہ دماغوں پر چھا گئے تھے اور عقلیت کے واحد نمائندہ تصور کئے جانے لگے تھے، اعتزال زمانہ کا فیشن اور روشن خیالی کی علامت بنتا جا رہا تھا، اس وقت امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کی اس عقلی اجارہ داری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور شریعت و سنت کی حمایت و نصرت اور عقائد اہل سنت کا اثبات اسی زبان، انہیں اصطلاحات اور اسی اسلوب میں کرنا شروع کیا جس کے سہارے معتزلہ نے اپنا علمی تفوق اور وحشی سیادت قائم کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں معتزلہ کا یہ عقلی طلسم ٹوٹ گیا اور سنت و شریعت کے حلقوں میں جو احساس کمتری تیزی

سے پھیلتا جا رہا تھا اور دفعۃً رک گیا۔ ابو بکر بن البصری کا مقولہ ہے کہ ”معتزلہ نے بہت سراٹھایا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے کے لئے شیخ ابوالحسن اشعری کو پیدا کیا۔ انہوں نے اپنی ذہانت و استدلال سے ان کو بند کر دیا“ اسی کا رنامہ کی بنا پر ابو بکر اسماعیلی جیسے مبصرین نے ان کو مجددین امت میں شمار کیا ہے۔

امام ابوالحسن اشعریؒ کے بعد ان کے مکتب خیال کے علماء نے ان کے کام کو جاری رکھا اور قاضی ابوبکر باقلانی، شیخ ابوالفتح اسفرائینی جیسے متکلم اور علامہ ابوالفتح شیرازی اور امام الحرمین جیسے مدرس و استاذ پیدا ہوئے، جنہوں نے اہل سنت کا علمی تفوق قائم رکھا لیکن اس عرصہ میں یونان کا علمی ذخیرہ عربی میں منتقل ہو چکا تھا اور وہ عقلیت و حق کا معیار بن گیا تھا، اور علم کلام کے حق میں جس کو سب سے زیادہ زمانہ شناس اور بیدار مغز ہونا چاہئے تھا جو وہ عقیدہ سرایت کر گئی تھی، علماء کلام کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ اشعری و ماتریدی عقائد کو تسلیم کیا جائے بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ عقائد کو ثابت کرنے کے لئے بھی وہی مقدمات و دلائل اور وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کئے جائیں جو اشاعرہ و ماتریدیہ نے استعمال کئے ہیں، حالانکہ زمانہ نئے دلائل اور نئے طرز استدلال اور نئے اجتہاد کا طالب تھا۔ امام ابوالحسن اشعری کا دور فلسفہ کا دور طفولیت تھا اور عالم اسلام میں اس کا نیا نیا تعارف ہوا تھا۔ پانچویں صدی میں وہ اپنے شباب کو پہنچ چکا تھا اور زندگی میں اپنے پنجے گاڑھ چکا تھا، اس وقت ایک نئی شخصیت نئے اجتہاد، تازہ دماغ اور نئے علم کلام کی ضرورت تھی، اس کے لئے انتظام خداوندی نے امام غزالی کو تیار کیا، امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں اصول و عقائد اسلامیہ پر نئے انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے ایسے مقدمات و دلائل قائم کئے جو اس زمانہ کے لحاظ سے زیادہ موثر اور اپنے اثر کے لحاظ سے زیادہ دلنشین و دل پذیر تھے، ان کے استدلال اور طریق بحث نے دین کا نیا وقار اور اہل سنت کا نیا اعتبار قائم کر دیا اور ہزاروں بے چین اور مضطرب دماغوں کے لئے وہ سکون و ایمان کا باعث ہوئے، اگرچہ علم کلام کے حلقہ نے اس وقت ان کی اس اہم دینی خدمت کی داد نہیں دی بلکہ علم کلام کی پرانی کیر سے ہٹنے کی بنا پر ان پر اعتراضات کئے، جن کا جواب امام صاحب نے ”فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة“ میں دیا ہے لیکن بالآخر عالم اسلام نے ان کے اس مجددانہ کارنامہ کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فلسفہ کا جواب دینے کے لئے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ فلسفہ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کریں اور اس پر علمی تنقید کرنے کا احتیاق پیدا کر سکیں، چنانچہ انہوں نے دو سال لگ کر (جیسا کہ ”المنقذ من الضلال“ میں لکھتے ہیں) فلاسفہ کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور باطنیہ کے عقائد و خیالات سے واقفیت پیدا کی، پھر انہوں نے اول مقاصد الفلاسفہ پھر تہافت الفلاسفہ لکھی۔ تہافت الفلاسفہ میں انہوں نے نیا کام یہ کیا کہ ابھی تک متکلمین اسلام کی طرف سے مدافعت و جوابدہی کیا کرتے تھے جو ہمیشہ سے ایک کمزور طریقہ ہے، امام غزالیؒ نے پہلی بار فلسفہ کے شیش محل پر سنگ باری کی، ان کے اس حملہ کا اثر یہ تھا کہ بقول مغربی مؤرخین فلسفہ، سو برس تک فلسفہ کی عمارت ان کے حملہ سے متزلزل رہی اور تقریباً نوے سال کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن رشد کی کتاب تہافت

التفاهہ کی صورت میں امام غزالی کی کتاب کا جواب پیش کیا۔

امام غزالی کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی بنیادوں پر منظم حملہ ہو اور نفس فلسفہ کو اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ فلسفہ کا سارا نظام قیاس آرائی سے زیادہ نہیں، اس کے لئے فلسفہ سے بڑی گہری اور وسیع واقفیت، ایک بڑے نقاد و دماغ اور ایک بڑے جری اور طاقتور قلم کی ضرورت تھی، اس کام کے لئے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ بڑھے، جو ہر طرح اس کے لئے موزوں تھے، انہوں نے اپنے مختلف رسائل بالخصوص اپنی تصنیف السرر علی المنطقیین میں فلسفہ اور اس کے پورے نظام فکر کو بے اعتبار ثابت کر دیا، ان کی مجتہدانہ کتابیں اب بھی ذہن کو نئی غذا، قلوب کو نیا اعتماد اور فکر کو تازگی اور نشاط بخشی ہیں۔

ادھر فلسفہ اور علم کلام دونوں نے مل کر جو ایک عقلی ظاہریت پیدا کر دی تھی اور عالم اسلام میں اس کے اثر سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا تھا کہ صداقت و یقین حاصل کرنے کا راستہ صرف استدلال و فکر ہے، اس کے خلاف مولانا جلال الدین رومیؒ نے قلمی جہاد کیا، ان کی زندہ جاوید مثنوی درحقیقت ساتویں صدی کے عقلی بحران کے خلاف قلب و روح کی ایک دلکش صدائے احتجاج ہے اور نہ صرف علم کلام کی ایک مجتہدانہ تصنیف ہے بلکہ نئے علم کلام اور نئے متدل کی بنیاد ہے، انہوں نے عقائد و حقائق اسلامیہ کے ثبوت کے لئے نئے دلائل اور نئی مثالیں دی ہیں، جو بیک وقت قلب و دماغ کو متاثر کرتی ہیں اور دونوں کی سلوٹوں کو دور کرتی ہوئی دلنشین و جاگزیں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کتاب کی تاثیر ابھی تک باقی ہے اور فلسفہ زدہ حلقوں میں اب بھی اس کے تیرے خطا ہیں۔

مولانا رومؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے بعد فلسفہ نے نئی کروٹ لی، اب وہ تصوف و اخلاق کی سرحدوں میں بھی گھس آیا اور سیاست و انتظام میں بھی دخل دینے لگا، اب اس کی تردید کے لئے تجاہل الہیات کے مباحث اور علم کلام کی کاوش کافی نہ تھی، اب فلسفہ کے ہمہ گیر اثرات کا مقابلہ وہ کر سکتا تھا جو یونانی الہیات کے ساتھ یونانیوں کے علم الاخلاق، مصر کی افلاطونیت جدیدہ اور اشراق، ہندوستان کے جوگ اور قرون وسطیٰ کے سیاسی تخیلات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتا ہو اور فلسفہ و تصوف، علم الاخلاق اور علم سیاست اور اسلام کے معاشی اصول اور نظام مالیات پر بھی اس کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہو، اس موقع پر شاہ ولی اللہ کی شخصیت نمودار ہوتی ہے، جنہوں نے حجة الله البالغہ اور ازالة الخفاء لکھ کر اسلام کی عظمت اور صداقت کا نقش قائم کر دیا اور علمی حلقوں میں اسلام کی نئی علمی ساکھ، علوم اسلامیہ کی زندگی کا ثبوت اور طبقہ علماء کا وقار قائم کر دیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے تسلط سے نئے نئے فتنوں سے سر اٹھایا، عیسائی مبلغین نے اسلام پر علانیہ حملے شروع کر دیئے اور علماء اسلام کو دعوت مقابلہ دی، پادریوں کا جواب دینے کے لئے اناجیل ان کی تفاسیر اور ان کی تاریخ تدوین اور مسیحیت و اسلام کے مابہ النزاع مسائل و مباحث کی براہ راست مطالعہ کی ضرورت تھی اس موقع پر طبقہ علماء ہی کے ایک فرد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی میدان میں آئے اور انہوں نے اظہار الحق اور ازالة الادہام جیسی کتابیں لکھ

کرمیجیت کی اشاعت میں ایک سنگ گراں رکھ دیا یہ کتابیں ہندوستان سے لے کر مصر و ترکی تک اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں اور ابھی تک لا جواب ہیں۔

دوسری طرف آریوں نے جن کو حکومت وقت کی شمل گئی تھی، اسلامی عقائد و الہیات پر حملہ شروع کر دیا اور عالم حدوث و قدم، ذات و صفات، کلام الہی حیات بعد الموت اور تاسخ، قبلہ اور حیات نبویؐ پر عقلی اعتراضات کرنے شروع کئے، ان کے جواب میں نہ تو قدیم کلامی دلائل پورے طور پر کارگر تھے نہ قدیم مقدمات اور قدیم اسلوب موثر تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان کے جواب کے لئے ایک نیا علم کلام تیار کر دیا، انہوں نے روزمرہ کی ہلکی پھلکی زبان میں چھوٹی چھوٹی مثالوں اور عام فہم دلیلوں میں بڑے بڑے علمی مسائل سمجھائے اور بڑے بڑے مباحث کا فیصلہ کیا۔ تقریر دل پذیر، حجت الاسلام، آب حیات اور قبلہ نما ان کی ذہانت و سلامت فہم اور دقیقہ شناسی کا بہترین نمونہ ہیں، دوسری طرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں ایک فتنہ کھڑا ہوا، یہ نبوت محمدیؐ کے خلاف ایک سوچی سمجھی بغاوت تھی اور اسلام کے پورے اعتقادی اور علمی و فکری نظام کو ڈانٹا میٹ کرنے اور خدا خواستہ اس کے ملبہ پر ایک نئی نبوت اور امامت کے قصر کی تعمیر کی کوشش تھی اس کے مقابلہ میں چند مخلص اور بالغ نظر علماء میدان میں آئے جن میں مولانا محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء اور مولانا سید انور شاہؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے۔

زندگی کی رفاقت اور زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل: یہ ساری تفصیل اس لئے سنائی گئی کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ علماء اسلام کی ذہانت اور جذبہ خدمت نے کبھی منزل پر قیام اور لکیر کا فقیر بننا گوارا نہیں کیا، انہوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا، ان کا ہاتھ زمانہ کی بغض سے کبھی جدا نہیں ہوا، ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں، انہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے جس زمانہ میں جس چیز، جس طرز اور جس اسلوب کی ضرورت سمجھی بلا تکلف اختیار کر لیا، انہوں نے اسلام سے وفاداری اور دین کی خدمت گزاری کا عہد کیا تھا، انہوں نے کسی مدرسہ فکر، کسی مکتب خیال اور کسی انداز فکر سے وابستگی کی قسم نہیں کھائی تھی۔ ہندوستان و مصر میں جب اسلام پر تمدن و تہذیب اور تاریخ و ادب کی راہ سے حملہ شروع ہوئے اور مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کی مستند شخصیتوں اور اس کے معیاری عہد پر اعتراضات کئے اور اسلام کے خدو خال کو بگاڑ کر بدنما شکل میں پیش کیا تو طبقہ علماء ہی میں سے ایسے اہل قلم اور ادیب و مصنف آگے بڑھے جنہوں نے ان مضامین پر ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اسلامیات بلکہ اردو ادب میں بھی یادگار ہیں اور جنہوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہزاروں کو نیا اطمینان اور دماغی سکون عطا کیا اور نہ صرف ان کا تذبذب دور ہوا بلکہ اسلام سے شیفٹنگی پیدا ہو گئی، مولانا شبلی کی الفاروق، الجزیرہ فی الاسلام، کتب خانہ اسکندریہ اس سلسلہ کی کامیاب تصنیفات ہیں۔

نصاب تعلیم کے تعمیرات: خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات

کا نمائندہ ہے، اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی و دینی تبدیلیوں کی بنا پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق و متقاضی تھا۔

دین کی نمائندگی کے لئے متنوع صلاحیتوں کی ضرورت: عزیزو! اس عہد انقلاب میں دین کی نمائندگی تعلیمات اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف ان کی تشریح و تفہیم بلکہ ان کی بلندی و برتری کا نقش قائم کرنے کے لئے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے، آپ اسلام کے سپاہی ہیں اور زندگی کے معرکہ کے لئے تیار ہو رہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیاری ہونے والی فوج کے لئے سب سے زیادہ ناموزوں سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم و جدید اسلحہ اور طریق جنگ کی بحث ہے، سپاہی کے لئے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کے لئے کون سا ہتھیار کارگر ہے اور کون سا طریق جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لئے تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فن جنگ سے اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہئے، عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا:

کل امرئ یسعی الی
یوم الہیاج بما استعدا

شراب کے حق میں بیان پر نیلوفر بختیار، اللہ سے معافی مانگیں، نیلوفر کا بیان دسین اسلام اور آئین پاکستان دونوں سے غداری کے مترادف ہے، چوہدری شجاعت نیلوفر بختیار کے بیان کا فوری نوٹس لیں، نیلوفر بختیار کی سینٹ کی رکنیت ختم کی جائے۔ ان خیالات کا اظہار وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے نیلوفر بختیار کے بیان پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ نیلوفر بختیار اپنے اس بیان پر اللہ سے معافی مانگیں کیونکہ ان کا یہ بیان دسین اسلام اور آئین پاکستان دونوں سے غداری کے مترادف ہے۔ انہوں نے کہا کہ نیلوفر بختیار عادی مجرم ہیں، انہوں نے فرانس میں پیرا گھائیڈنگ کے دوران پاکستان کی عزت کو خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا اور اب وہ شراب پر سے پابندی ہٹوا کر ملک کے دینی اور آئینی تشخص کو مٹانے کی جسارت کر رہی ہیں، اس لیے انہیں اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والے ملک کے ایوان بالا کی رکنیت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، ان کی رکنیت فی الفور کا عدم کی جائے۔ مولانا محمد حنیف جالندھری نے مسلم لیگ ق کی قیادت بالخصوص چوہدری شجاعت سے مطالبہ کیا کہ وہ نیلوفر بختیار کے اس بیان کا فوری نوٹس لیں۔ (پ۔ر)